© rasailojaraid.com

ایسی مزاحمتوں کا ایک خزانہ ہے اس کے لیے آپ کو ہاورڈ زن (Howard Zinn) کی لکھی ہوئی تاریخ کی کتاب پڑھنی ہوگی جو ریاست ہائے متحدہ کے عوام کی تاریخ ہے جو آپ کو اپنا آپ یاد دلائے گی۔

آپ لوگوں میں سے لاکھوں افراد ایسے ہیں جو اپنی حکومت کے گمراہ کن اور بے رحمانہ پروپیگنڈہ سے متاثر نہیں ہوئے اور اپنی حکومت کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ یہ لوگ قابل مبارک باد ہیں کیونکہ محب وطنی کی اس فضا میں جو یہاں پھیلا دی گئی ہے ان کا ردعمل اتنا ہی منصفانہ اور بہادرانہ ہے جتنا ایک افغانی، عراقی یا فلسطینی کا ہے جو اپنے مادر وطن کے لیے جدوجہد میں مصروف ہے۔

اگر آپ اس جنگ میں شریک ہوں تو پھر آپ ہزاروں لاکھوں ہی نہیں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں ہوں گے اور دنیا بھر کے عوام آپ کو خوشی سے مبارک باد دیں گے۔ آپ خود دیکھیں گے بلکہ محسوس کریں گے کہ ظالم کے بجائے امن پسند اور خوف زدہ ہونے کی بجائے تحفظ کا احساس کتنا خوبصورت ہوتا ہے۔ تنہا رہ جانے کے بجائے دوستوں میں رہنا اور نفرت کی جگہ چاہا جانا کتنا اچھا لگتا ہے۔ میں آپ کے صدر سے اختلاف پسند نہیں کرتی لیکن آپ کسی طرح بھی ایک عظیم قوم نہیں ہیں۔ لیکن آپ لوگ عظیم لوگ کہلائے جا سکتے ہیں۔ تاریخ آپ کو یہ نادر موقع دے رہی ہے۔ وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دیجیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یورپ میں مسلمان آبادی

عمر تاسپنر*

ترجمہ: عبداللہ سیفی

اگرچہ لاکھوں امریکیوں کے لیے اسلام ابھی تک ایک اجنبی مذہب ہے لیکن اس کے برعکس اسلام یورپ میں بسنے والوں کی مقامی سیاست کا لازمی جزو ہے۔ یورپی یونین میں ۱۵ ملین سے زیادہ مسلمان بستے ہیں جو کہ صرف امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کی مجموعی آبادی کا تین گنا ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یورپ میں ہر آنے والے دن کے ساتھ اسلام ایک طاقت ور سیاسی قوت کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

یورپ میں بسنے والے مسلمان مختلف ممالک سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک مختلف قسم کے پس منظر کی بناء پر متنوع قسم کے مذہبی رجحانات کا اظہار کرتا ہے لیکن ان سب میں ایک ایسا نقطہ اتصال پایا جاتا ہے جو کہ یورپ میں بسنے والے مسلمانوں کا تعلق بقیہ مسلم دنیا سے جوڑتا ہے اور وہ نقطہ اتصال فلسطین اور فلسطینیوں کے لیے اُن کی ہمدردیاں ہیں۔ اس بات کی اہمیت اس وقت دوچند ہو جاتی ہے جب اپنے عرب بھائیوں کے برعکس جو کہ اپنے ہی ممالک میں ووٹ کے حق سے محروم ہیں، یورپ میں بسنے والے مسلمان انتخابات کے موقع پر پوری آزادی سے اپنے ووٹ کا حق استعمال کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی اس بڑھتی ہوئی سیاسی قوت سے خود یورپی ممالک کے مابین پہلے سے موجود کھچاؤ مزید بڑھ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس امر کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ صرف جرمنی اور فرانس میں تقریباً دس ملین مسلمانوں کے مقابلے میں صرف سات لاکھ یہودی آباد ہیں اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ کون سی وجوہات ہیں کہ جن کی بناء پر یہ دونوں ممالک، امریکی نقطۂ نظر کے برعکس مشرق وسطیٰ کو دوسرے زاویے سے دیکھتے ہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار کسی صورت ممکن نہیں کہ یہ یورپ میں بسنے والی

*Omer Taspinar, "Europe's Muslim Street," *Foreign Policy*, Mar./Apr. 2003, pages: 76-77.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلم آبادی ہی تھی کہ جس نے ان دونوں ممالک کو مجبور کیا کہ وہ عراق پر امریکی حملے کے معاملے پر اپنے خدشات کا کھل کر اظہار کریں۔یہی معاملہ امریکہ کی طرف سے اسرائیل کی اندھی حمایت کا بھی ہے۔
برسلز، برلن، پیرس یا واشنگٹن میں اہل اقتدار چاہے اس بات کو پسند کریں یا نہ کریں لیکن اس حقیقت سے صرف نظر ممکن نہیں کہ مستقبل قریب میں یورپی مسلم آبادی خارجہ پالیسی کے ایوانوں میں ایک طاقتور آواز بن کر ابھرنے والی ہے۔ یورپ میں مسلمانوں کی اس روز افزوں بڑھتی ہوئی قوت میں دو عوامل کا بہت زیادہ عمل دخل ہے۔اولاً تیزی سے بڑھتی ہوئی مسلم آبادی ثانیاً مکمل شہریت کے مواقع۔
یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یورپ میں مسلمانوں کی آمد، اُن غیر ارادی پیدا شدہ حالات کا نتیجہ ہے جو کہ آج سے قریباً نصف صدی قبل رونما ہوئے۔ جنگ عظیم دوم کی بھٹی سرد پڑ جانے کے بعد ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں جب یورپ کو ہنر مندوں کی شدید کمی کا سامنا تھا تو انہوں نے اس موقع پر اپنی سست رفتار معیشت کو تیز کرنے کے لیے بڑی تعداد میں ترکی، الجزائر، مراکش اور پاکستان کے باسیوں کے لیے اپنے دروازے کھول دیے۔
کسی بھی میزبان ملک کو اپنے ان ''مہمان مزدوروں'' کے بارے میں یہ توقع نہیں تھی، جیسا کہ جرمنی نے اپنی مخصوص بے تکلفی سے انہیں یہ نام دیا، کہ وہ وہاں زیادہ عرصہ قیام کریں گے۔ دوسرے تمام اچھے مہمانوں کی طرح ان کے بارے میں بھی خیال تھا کہ یہ بھی یورپ کو خیر باد کہہ دیں گے۔اور ایسا کرنا تو اس وقت اور بھی ضروری ہو گیا جب ۱۹۷۰ء میں یورپ شدید کساد بازاری کا شکار ہوا۔لیکن بجائے اس کے کہ مسلمان یورپ کو خیر باد کہتے ان کے خاندان بھی ان سے آ ملے اور یوں یورپ میں ترکوں، الجزائریوں، مراکشیوں، تیونسیوں اور پاکستانیوں کی ایک نئی نسل پیدا ہوئی اور اب بھی بہت سوں کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔آج صورت حال یہ ہے کہ یورپ میں غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کی شرح پیدائش تین گنا زیادہ ہے اور اگر یہی رجحان جاری رہا تو ۲۰۱۵ء تک یورپ میں مسلمانوں کی آبادی دوگنا ہو جائے گی اور اس کے برعکس دوسری جانب غیر مسلم آبادی ۳ء۵ فیصد تک سکڑ جائے گی۔
آبادی میں اضافے کے متوازی مسلم رائے دہندگان کی تعداد میں اضافے کا عمل بھی جاری ہے۔ فرانس میں تقریباً ۵ سے ۷ ملین پر مشتمل مسلمانوں میں سے نصف تقریباً پہلے ہی فرانسیسی شہریت حاصل کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چکے ہیں۔ اور ایسی ہی صورت حال برطانیہ میں بسنے والے تقریباً دو ملین مسلمانوں کی ہے۔ مزید براں ۲۰۰۰ء میں جرمنی بھی ان ممالک کی صف میں شامل ہو گیا جہاں شہریت آبائی تعلق کو نہیں بلکہ جائے پیدائش کو مدنظر رکھ کر دی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے جرمنی میں شہریت کے نئے قوانین کی بدولت پہلے ہی تقریباً پانچ لاکھ افراد ووٹرز کی فہرست میں شامل ہو چکے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان قوانین نے بہت سے دوسرے مسلمانوں پر بھی شہرت کے دروازے کھول دیے ہیں۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ہر سال صرف جرمنی میں تقریباً ایک لاکھ ساٹھ ہزار نئے مسلمان شہری بن رہے ہیں۔ اور ان کی تعداد میں اسی رفتار سے اضافہ ہوتا رہا تو آئندہ دہائی میں ان کی تعداد تین ملین کے لگ بھگ ہو جائے گی۔

چاہے وہ جرمنی ہو یا کوئی اور یورپی ملک، مسلمانوں کا ووٹ ایک اہم حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کی تازہ ترین اور واضح مثال ستمبر میں ہونے والے انتخابات ہیں جن میں حال ہی میں شہریت حاصل کرنے والے ''جرمن ترکوں'' نے سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے اتحاد کی کھل کر حمایت کی۔ اس طرح ان ''جرمن مسلمانوں'' نے تارکین وطن کے مخالف کرسچین ڈیموکریٹس کو ایک طرح سے سزا دی جو کہ یورپی یونین میں ترکی کی شمولیت کے مخالف ہیں۔ اور انہوں نے بھرپور انداز میں (SPD Green Coalition) کی ان اصلاحات کی حمایت کی جو کہ وہ قدیم جرمن قانون شہریت کے خاتمے کے لیے کر رہے تھے اور اس سے بھی بڑھ کر بری خبر جرمن کرسچین ڈیموکریٹس کے لیے یہ ہے کہ ۲۰۰۶ء میں ہونے والے آئندہ انتخابات میں لگ بھگ ایک ملین جرمن ترک اپنا حق رائے دہی استعمال کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔

ایک اور بڑی کامیابی جو کہ مسلمانوں کو تنظیمی لحاظ سے حاصل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ حال ہی میں فرانس جہاں یورپ میں بسنے والے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمیونٹی آباد ہے، کی متنوع مسلم آبادی کی نمائندگی اب ایک متحدہ فرنچ کونسل برائے اسلام کرے گی اور یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ مستقبل قریب میں یہی مسلم کونسل فرانس میں ایک مضبوط لابی کا کردار ادا کرے۔ اس سے بڑھ کر ایک اور اقدام کہ جس سے مسلمانوں کے یورپ میں بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ فرانسیسی وزیر اعظم جین پیئر (Jean Piere Raffarin) کا شمالی افریقہ سے تعلق رکھنے والے دو مسلمانوں کا اپنی کابینہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں شامل کرنا ہے۔

ایک جانب مسلمان ووٹ کی طاقت سے مسلح ہیں اور دوسرے جانب وہ تیزی سے ایک مضبوط لابی کا کردار ادا کرنے کے گُر بھی سیکھ رہے ہیں اور وہ دن زیادہ دُور نہیں جب یورپ میں بسنے والے مسلمان مصر اور سعودی عرب میں بسنے والی عرب آبادی سے بھی زیادہ سیاسی قوت حاصل کریں گے۔ لیکن گیارہ ستمبر کے حملوں نے یورپ میں مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو ایک بڑھتے ہوئے خطرے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ یورپ میں بسنے والے مسلمانوں کی اکثریت امن پسند اور قانون کی پاسداری پر یقین رکھتی ہے لیکن اس سب کے باوجود یورپی حکومتیں بعض یورپی مسلمانوں کے ماضی میں دہشت گردی میں ملوث ہونے کی وجہ سے ان کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہیں اور اس خدشے کو مزید تقویت اس وقت ملی جب جرمنی، فرانس، اٹلی اور برطانیہ میں القاعدہ کے قائم کردہ مراکز کا انکشاف ہوا۔

ان واضح شکوک وشبہات اور تعصّبات کی بناء پر یورپ کی نئی ابھرنے والی کثیر ثقافتی حیثیت یورپی سرزمین پر اسلامی دہشت گرد حملوں کا ایک نشانہ بن جائے گی۔ ایک اور مسئلہ یورپی مسلمانوں اور یورپ کی بڑھتی ہوئی یہود دشمنی (anti-semitisim) کے درمیان تعلق کا ہے۔ یہ سچ ہے کہ یورپی اسرائیل پر زیادہ تنقید کرتے ہیں اور دوسری جانب وہ فلسطین کی حمایت کرتے ہیں۔ مجموعی لحاظ سے یورپ کو یہ بات سمجھنے میں سخت دشواری کا سامنا ہے کہ آخر وہ کون سی وجوہات ہیں کہ جن کی بناء پر اسرائیل جیسا ایک چھوٹا سا ملک دنیا کی واحد سپر پاور (امریکہ) پر اس قدر اثر ورسوخ رکھ سکتا ہے۔ لیکن امریکہ میں شاید کم لوگ ہی جانتے ہوں گے کہ یورپ میں اسرائیل کے سب سے بڑے مخالف مسلمان ہیں۔

فرانس میں یہود مخالف (anti-semitisim) واقعات کے ذمہ دار دائیں بازو کے انتہا پسند نہیں ہیں، جو فرانسیسی نسل کو یہودی بداثرات سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں، بلکہ ۲۰۰۱ء میں یہود دشمن (anti-semitisim) جن تقریباً ۴۰۰ کارروائیوں کا اندراج ہوا، ان میں سے زیادہ تر کارروائیاں شمالی افریقہ نژاد مسلمان نوجوانوں سے منسوب کی جاتی ہیں۔ اور جب بھی اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے درمیان تناؤ میں اضافہ ہوتا ہے تو یہ شرح اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ یہ مسلمانوں کے اثر اور کردار کا ایک اور ثبوت

© rasailojaraid.com